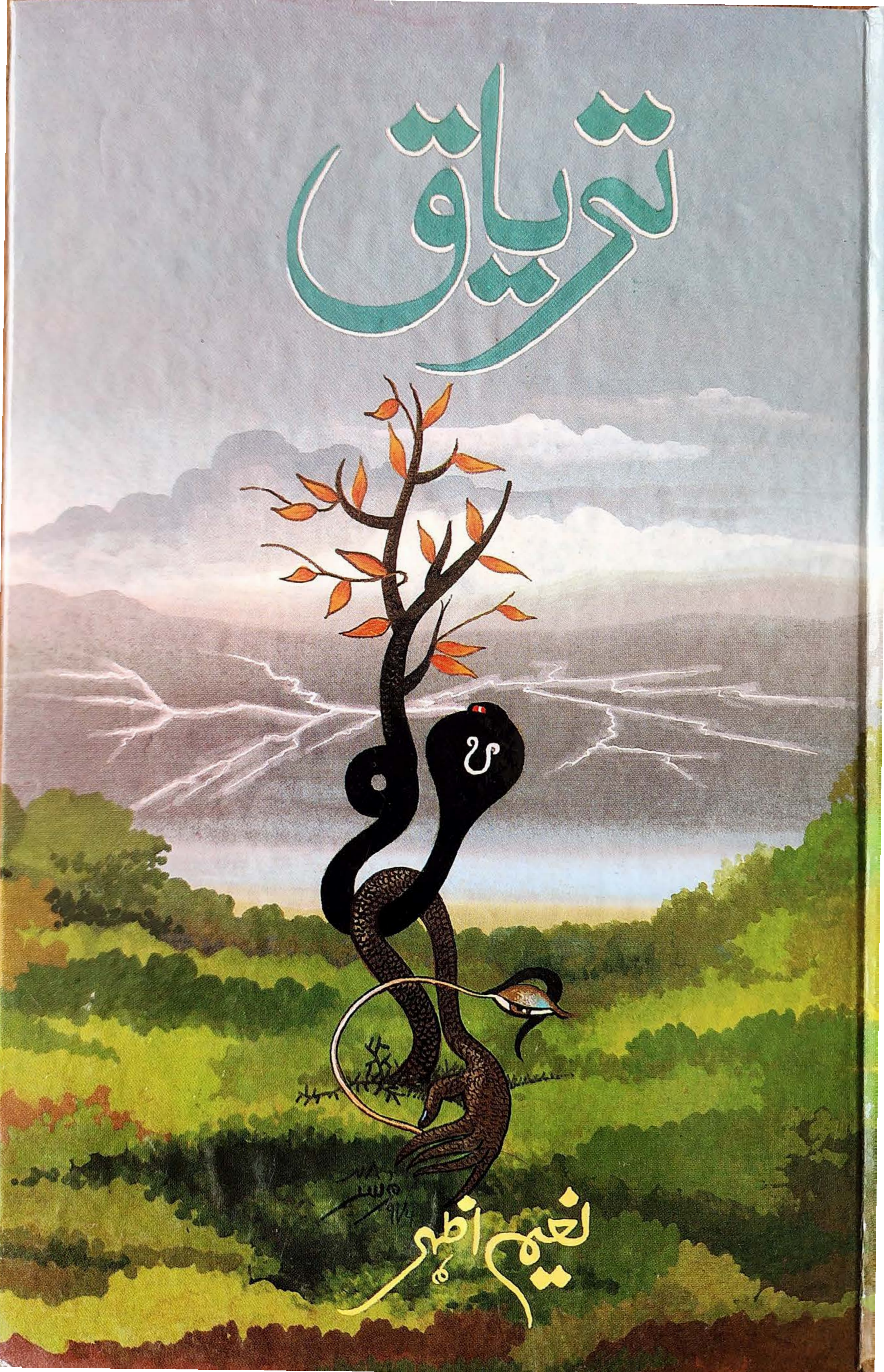
تریاق
نعیم اظہر

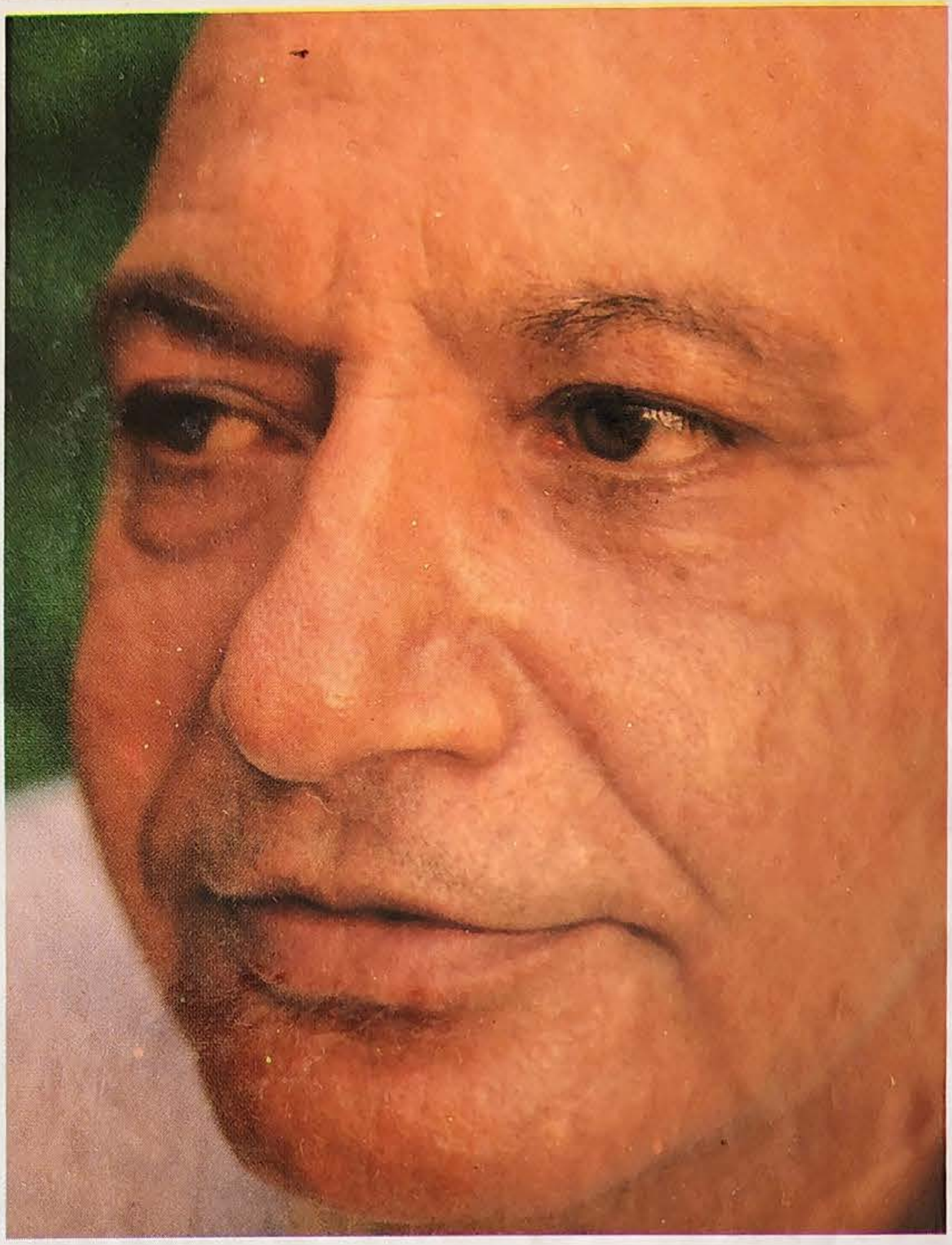

نعیم اظہر کی دیرُوزہ شعری رَو میں، جہاں تجسُّس، تاثر، تحقیق اور جستجو پر مبنی تخیّلاتی نظام متشکل ہُوا، وہاں "تریاق" کی شعری ساخت کے ارتقائی عمل میں آفاقی ضابطۂ حُسن و عشق کی قوّت سے بالیدگی پانے والی نظریاتی صورت گری کے الوان کا انکشاف بھی ہُوا ہے۔ نعیم اظہر کی شاعری عشقِ حقیقی کی منوّر منازل سر کرنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کو مثبت اقدار سے ممتاز کرتی ہوئی مناصبِ ذات کی شناخت اور خودشناسی کے فریضے سے عہدہ برآ ہوئی ہے۔ حقیقتِ اَمر میں تضادات اور خامیوں سے مُبرّا باشرف زندگی کی لگن، نعیم اظہر کو عصرِ حاضر کا نمایاں مقصدی شاعر بنانے کے لیے سرگرمِ عمل رہی ہے۔ "تریاق" میں شامل غزلیات کا اسلوبِ فکر رومانوی حقیقت پسندی اور نُقطہ نظر جمالیاتی جہت نمائی سے معنون ہے۔ نعیم اظہر نے اپنی شاعرانہ بلند حوصلگی کی استعداد سے جسدِ معاشرت میں رُوحِ اخلاقیات پھونکنے والے خالق کے طور پر انسانیت سے اُنسیت کی اسطور تخلیق کی ہے، تبھی ان کی غزلیہ شاعری میں محبّت کے اظہار اور حیرت کے استفسا سے مملوُ شعری جوہر کی بدولت ایک اچھُوتے طرزِ احساس کا تعین ہو پایا۔

اظہر غوری

تریاق

تریاق

نعیم اظہر

الحمد پبلی کیشنز

رانا چیمبرز۔ سیکنڈ فلور۔ (چوک پرانی انار کلی) ۔ لیک روڈ۔ لاہور

ہماری کتابیں..........

خوبصورت، معیاری اور کم قیمت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

صفدر حسین

جملہ حقوق بحق نفیس اظہر محفوظ ہیں

الحمد

ضابطہ :

بار اوّل : اکتوبر ۱۹۹۱ء

ناشر : عطا محمد

مطبع : شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

پورٹریٹ : راجہ نیّر

سرورق : تنویر مرشد

کتابت : محمد اشرف انجم

قیمت : ۶۰/- روپے

انتساب

اپنے مرشدِ حقیقی

انتہائی بزرگ و برتر ہستی

عبدالنبی غلام نازک کریمؒ

اور

تحریکِ پاکستان کے جیالے سپاہی

صاحبِ نظر مجاہد

والدِ محترم پیر انور علی شاہؒ (انور ہاشمی)

کے نام

جن کی نگہداشت اور تربیت نے مجھے ہمیشہ کے لیے
تفکّر کی دنیا کا باشندہ بنا دیا۔

فہرست

۱	پیش لفظ	جیلانی کامران	۱۳
۲	"چہرہ بہ چہرہ" سے "تریاق" تک کا سفر	عارف عبدالمتین	۱۹
۳	سب تعریفیں تیری یارب، سب تفسیریں تیری ہیں		۲۱
۴	فردیات	(حمدیہ)	۲۲
۵	دُعا		۲۳
۶	فردیات	(نعتیہ)	۲۴
۷	رنگ و رعنائیِ تہذیب کا محور توؐ ہے		۲۵
۸	جب مدح تری مظہرِ ابرارؐ کروں میں		۲۷
۹	مجھ پہ برسے ترے انوار رسولِ عربیؐ		۲۹
۱۰	عہد شکن		۳۳
۱۱	ہم جب کبھی بھی روپ نگر سے گزر گئے		۳۵
۱۲	جانے ہجر کی رُت کا مجھ پہ کیسے آن ظہور ہوا		۳۷
۱۳	اے شوق مرے دل میں کبھی یوں بھی اترنا		۳۹
۱۴	منزلِ جاں کو جہاں بھی کرب میرا چاہیئے		۴۱
۱۵	مری دفا پہ غضبناک کب سماج نہ تھا		۴۳
۱۶	فردیات		۴۵
۱۷	مان لیتا ہوں کہ اس کا سامنا ہو جائے گا		۴۷

۱۸	تجسّس دل میں کیوں گھر کر گیا ہے	۴۹
۱۹	دل کے دیپک کو جلائے رکھنا	۵۱
۲۰	خود سے باہر بھی اب سفر کر لیں	۵۳
۲۱	آئینِ مروّت کو روا کر کے تو دیکھو	۵۵
۲۲	کہیں میں نے جب بھی چاہی تری راہ تک رسائی	۵۷
۲۳	فردیات	۵۹
۲۴	چھاننے دے خاکِ منزل بند دروازہ نہ کر	۶۱
۲۵	خدشہ	۶۳
۲۶	اضطرابِ شوق کی وارفتگی اچھی نہ تھی	۶۵
۲۷	ریا کچھ بیج ایسے بو گئی ہے	۶۷
۲۸	وہ اس سے پہلے نہ تھا میرے آشناؤں میں	۶۹
۲۹	فردیات	۷۱
۳۰	جب کوئی عہد نہ پیماں ہو گا	۷۳
۳۱	ہر آرزو یوں کیفرِ کردار تک گئی	۷۵
۳۲	خوشیوں میں کھوج ہے نہ نشاں تک غموں میں ہے	۷۷
۳۳	تیرے ملن کی سوچ سے تھرّا گیا ہوں میں	۷۹
۳۴	نئی بُنیاد	۸۱
۳۵	ہم قدم تو ہے تو آسان سفر بھی ہو گا	۸۳
۳۶	دل جب کبھی بھی دشتِ طلب کو سجا گیا	۸۵
۳۷	وہ مجھ میں رہتے ہوئے مجھ سے ماورا کیا ہے	۸۷
۳۸	وہ مری منزل بھی ہے اظہر مری منجدھار بھی	۸۹
۳۹	کب سے تن پہ جھیل رہا ہوں سپنوں کی برساتوں کو	۹۱
۴۰	خوابِ ہستی ٹوٹ کر جب بھی بکھر جاتا رہا	۹۳

۴۱	فردیات	۹۵
۴۲	اب آئے یا نہ آئے حقیقت نمود پر	۹۷
۴۳	میرے وطن	۹۹
۴۴	مرزا غالبؔ کی نذر	۱۰۱
۴۵	علامہ اقبالؒ کے حضور	۱۰۳
۴۶	فیض احمد فیضؔ کی رحلت پر	۱۰۵
۴۷	اچھا ہوا کہ خلق خدا پر عیاں نہ تھی	۱۰۷
۴۸	دل ہی اب خو گرِ شنا ٹھہرے	۱۰۹
۴۹	جب سے ہوئی ہے عشق سے فرصت عطا مجھے	۱۱۱
۵۰	پرواز کے جنوں میں اڑیں دھجیاں مگر	۱۱۳
۵۱	سوچتا ہوں وقت کیا یونہی گزرتا جائے گا	۱۱۵
۵۲	فردیات	۱۱۷
۵۳	نہیں ہے تُو جو میرا منتظر تو یاد نہ آ	۱۱۹
۵۴	نقشِ کُہنہ مٹا کے دیکھیں گے	۱۲۱
۵۵	اب مضطرب ہے شوق کہ وہ راستہ ملے	۱۲۳
۵۶	فردیات	۱۲۵
۵۷	تریاق	۱۲۷

جن جنگلوں میں تجھ کو ڈسے جا رہے ہیں سانپ
تریاق زہر کا بھی انہی جنگلوں میں ہے!

پیش لفظ

اُردو شاعری کے حالیہ ماحول میں غزل گوئی اور نظم نگاری نے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ اس فن کو اختیار کرتے وقت کوئی بھی یہ سوال پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ وہ شاعر کیوں ہے؟ یا یہ کہ اس نے اس اظہاری حوالے کو اپنے لیے کیوں منتخب کیا ہے؟ اور وہ غزل یا نظم کیوں لکھنا چاہتا ہے؟ یا کیوں لکھ رہا ہے؟ ان سوالوں کا جو ایک ہی سوال کی شکلیں بھی ہیں۔ شاید کسی کے پاس کوئی قابلِ ذکر یا قابلِ فہم جواب موجود دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ عہدِ حاضر کے شعراء صرف روایت ہی کے زیرِ اثر لکھنے پر مجبور ہوئے ہیں اور چونکہ ہمارے تمدّن کی فضا میں شعریات بکھری ہوئی ہیں۔ اس لیے غالباً کسی کو ایسی آب و ہوا سے غزل اور نظم کشید کرنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ ہمارا ماحول شاعری کا ہے اور غالباً اسی لیے ہمارا ہر سانس بھی غزل بن سکتا ہے۔ علاوہ ازیں ماحول میں جس نوع کے مضامین پائے جاتے ہیں ان سے ہمارا انسانی رویّہ جس تجربے کی گرفت سے گزرتا ہے وہ متعدد نوع کی واردات کو بھی بخوبی نمایاں کر سکتے ہیں ان دونوں سہولتوں نے ہمارے ادبی ماحول میں شعر و شاعری کو وہ مقام دیا ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

روایتی شعر گوئی جس میں شکایتِ زمانہ اور انسان کی شکستہ حالی کا احتجاج دکھائی دیتے ہیں۔ ایک لمبے عرصے سے ہماری شاعری کی نمائندگی کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں ایسے ہی مزاج کے خلاف ردّ عمل رونما ہوا تھا اور غزل کی دنیا سے بلبل اور تغزل دونوں کو بے دخل کرنے کی روش نمایاں ہوتی تھی۔ ہمارے حالیہ دَور میں انسان اور صورتحال کے حوالے سے جو طرزِ احساس پیدا ہوا ہے۔ اس نے بھی شاعری کی مزید نشوونما کی راہ میں رکاوٹیں حائل کر دی ہیں اور انسانی تجربہ غیر تخلیقی ہو جانے کی آزمائش سے دوچار ہوا ہے۔ ایسی کیفیت میں شاعروں نے نئے راستے

تلاش کرنے کی ذمہ داری بھی قبول کی ہے تاکہ غیر تخلیقی تجربے کی گرفت سے آزادی حاصل ہو، اور شاعری کے ساتھ ایک نئے تہذیبی سفر کی ابتدا بھی ممکن ہو۔ تلاش کے اس سفر میں نعیم اظہر بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی غزل کے ساتھ اپنے عہد کے لیے نئے ارادوں کی کھوج میں لفظوں کے نئے رشتے تلاش کرتا دکھائی دیتا ہے۔

الفاظ کے نئے رشتے ان معنوں میں نعیم اظہر کی غزل میں ظاہر نہیں ہوئے۔ جیسے لسانی تشکیلات کے زیرِ اثر نمایاں ہوئے ہیں۔ کیونکہ نعیم اظہر کی شعری کیفیت لفظوں کی کاریگری سے تعلق نہیں رکھتی۔ نعیم اظہر نے الفاظ کو کسی نئے طرزِ احساس کو واضح کرنے کا وسیلہ بنایا ہے اور اس طرح لفظ کے معانی سے طرزِ احساس کی رُخ نمائی کا مقصد حاصل کیا ہے۔ ان لفظوں میں جزیرے، خود، داعی، عیب، راستہ، سفر، ماورار، وجود، پستی، خواب اور خوابوں کی برسایتی صبح، صُبحِ مسّرت، صبح کی صورت، اندر کی ہوس، پیار، روشنی، حق، تلاشِ حق، پیار کی خوشبو، نشیمن، برسوں کی کثافت، عشرتِ فردا کا بسیرا، خود شناسی اور خود فریبی کا زہر ایسے نمایاں اشارے ہیں جو طرزِ احساس کو ہمہ وقت مرتب کرتے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس ذخیرۂ الفاظ میں کلاسیکی غزل کا محاورہ بہت کم سنائی دیتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ غزل اپنے حالیہ زمانے میں ایسے ہی ذخیرۂ الفاظ میں اپنی سرشت اور پہچان کو تلاش کرتے دکھائی دیتی ہے۔

۲۔ ایسے شاعر غالباً بہت کم ہیں جو اپنے شعری وصف کو ایک ایسی کومٹمنٹ قرار دیتے ہوں جس سے مفر ممکن نہیں ہے۔ کومٹمنٹ کی اصطلاح ہمارے عہد کی ہر دلعزیز شناخت بھی بن چکی ہے لیکن یہ کومٹمنٹ شاعر کے اقرار نامے سے کہیں زیادہ اپنے عہد کی صورتحال (اور اس کی عکس گری) سے تعلق رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کومٹمنٹ سے زیادہ ضروری شاعر کا ایک تخلیقی سرشت کے ساتھ باندھا ہوا عہدنامہ ہے۔ اس عہد نامے کو مذہبی زبان میں مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے۔ شاعری میں اس اقرار نامے کا بہت کم ذکر ہوا ہے اور قابلِ غور یہ ہے کہ شاعری کے بدلتے ہوئے ماحول میں ایسی صورت نعیم اظہر کے تجربے میں دکھائی دی ہے۔ یہ دو اشعار بامعنی ہیں۔

بنتا جاؤں پل پل اپنی پیار کتھا کو گِنتوں میں
سوچ رہا ہوں میں ہی آخر کیوں اس پر مامور ہوا
جو بھی بیتی، بیتی مجھ پہ اس بے نام تناؤ میں
میں جتنا مختار تھا، میرا دل اتنا مجبور ہوا

ان شعروں میں نعیم اظہر نے اپنے تخلیقی کردار کو اس اصطلاح کے حوالے سے بیان کیا ہے جو مذہبی مفہوم کے قریب تر بھی ہے، 'مامور ہونا'، کومٹمنٹ سے کہیں زیادہ بامعنی ترکیب ہے اور شاید کومٹمنٹ کے بعد کسی جدید شاعر کے لیے فرار کرنا بھی ممکن ہو اور سمجھوتے کرنے کی ترغیب بھی قابلِ توجہ ہو، لیکن مامور ہونے کے بعد صرف ایک ہی راستہ کھلتا ہے جو اختیار کو مجبور ہونے میں بدل دیتا ہے۔ نعیم اظہر کی شعری نفسیات میں اس پہلو کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اگر اس زاویہ سے دیکھا جائے جو لفظ 'مامور' کے بطن سے پھوٹتا ہے تو نعیم اظہر کا صورتحال کے ساتھ رشتہ بھی ایک بدلے ہوئے تناظر میں سامنے آتا ہے۔ صورتحال کو ادبی حوالے سے معاشرتی اور عمرانی آشوب کے ساتھ نسبت دی گئی ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ صورتحال ایسے افراد سے نسبت رکھتی ہے جنہوں نے بیابان میں آگ جلائی اور جب روشنی چاروں طرف پھیلنے لگی تو اس کا نور اٹھا لیا گیا اور وہ افراد بے نور آگ کی جلن میں سرگرداں ہوتے رہے۔ ہمارے ادب میں ایسے ہی تجربے کی گواہی ملتی ہے اور جن افراد کا علم ہوتا ہے ان کی آنکھوں اور ان کے دلوں پر بے حسی کی چھاپ دکھائی دیتی ہے اور ایسا پردہ نظر آتا ہے جس سے ان کے جاننے کی قوتیں سلب ہو چکی ہیں۔ ممکن ہے صورتحال کا ایسا تجربہ ہمارے لیے مانوس بھی ہو۔ کیونکہ ہماری مذہبی روایت ایک مقام پر بنی اسرائیل بھی ایسے حادثے سے دو چار ہوئے تھے اور قیام پاکستان کے بعد روشنی کی حفاظت نہ کرنے کے جرم میں ہمارے ساتھ بھی ایسی صورتحال کا سامنا ہوا ہے جس کی نشاندہی ہمارا ادب کرتا رہا ہے۔ ایسی صورتحال میں شاعری کیا کر سکتی ہے۔ نعیم اظہر نے اپنی غزل میں اس سوال کو اپنے سامنے رکھا ہے۔

۳۔ انسانی صورتحال کا محور خواہ اس کی کوئی بھی توجیہہ کی جائے، انسانی سرشت ہے۔ جو زمانے کے اثرات سے بالعموم متاثر ہوتی ہے۔ ہمارے ادب نے اس انسانی سرشت کو غیر معمولی تاریک

خد وخال کے ساتھ پیش کیا ہے اور اس طرح شاید یہ رائے دی ہے کہ اس طرح صورتحال کے اندمال کا کوئی موقعہ ضرور پیدا ہوگا۔ ایسے طریقِ کار نے انسانی سرشت کی بدنمائی کو بُری طرح نمایاں کیا ہے اور انسانی صورتحال میں ایسی بدنمائی بڑھتی اور پھیلتی دکھائی دیتی ہے۔ شاعری اور نثری ادب نے زیادہ سے زیادہ یہ کام کیا ہے کہ شکایت زمانہ اور احتجاج کے رویے آشکار کیے ہیں۔ عیب جوئی نے فنی جواز حاصل کر لیا ہے۔

انسانی صورتحال میں برائیوں کے غلبہ پانے کی کیفیت کو ادب اور شاعری نے تسلیم تو کیا ہے لیکن اس کے ساتھ عہدہ برآ ہونے کے لیے جو طریقِ کار استعمال کیا ہے اس کے ناکام ہونے سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا، قدیم اخلاقیات کے مطابق برائیوں کا غلبہ نفسِ امّارہ کے غلبے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے ایک رائے یہ رہی ہے کہ نفسِ امّارہ کو ہر ممکن طریقے سے کچلا جائے۔ حالیہ ادبی فکر میں یہ طریقِ کار شکایت اور احتجاج میں نظر آتا ہے اور سیاسی فکر میں اسے استحصال کا خاتمہ اور برائیوں سے پاک معاشرے کو کسی انقلاب کے ذریعے وجود میں لانے کی کوششوں میں بیان کیا گیا ہے۔ مذہبی زبان میں یہ طریقِ کار امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے رویّے میں دکھائی دیتا ہے۔ شاعری اور انسانی صورتحال کا باہمی تعلق ان رویّوں سے برآمد ہوتا رہا ہے۔

تاہم اگر نفسِ امّارہ کو انسانی سرشت کی ابتدائی غیر تہذیب یافتہ صورت قرار دیا جائے تو بھی نفسِ امّارہ انسان ہی کی سرشت کا عارضہ دکھائی دیتا ہے اور اسے بشری اور حیوانی حیاتیات کے درمیان مشترک رویّہ گردانا دشوار نظر آتا ہے۔ اسی لیے امام قشیری نے نفسِ امّارہ کے کچلنے کو نفسِ امّارہ کی تربیت میں بدلنے کی تلقین کی ہے۔ امام قشیری کی رائے ہے کہ نفسِ امّارہ انسانی فطرت سے کھرچنا محال ہے، لیکن اس کی تربیت اور تہذیب ممکن ہے۔ شاید اسی لیے پیداواری رشتوں کے نئے نظام پر ہمارے زمانے میں زور دیا گیا ہے تاکہ نئے قائم کیے گئے پیداواری رشتوں سے نفسِ انسانی کی بہتر طور پر تکمیل کی جا سکے اور ایک بہتر معاشرے کے معرضِ وجود میں آنے کے امکانات ظاہر ہوں!

میں نے ان باتوں کا تذکرہ کچھ اس لیے بھی کیا ہے کہ نعیم اظہر کا شمار ان شاعروں میں کیا

جا سکتا ہے جو ایسے مسائل سے دلچسپی بھی رکھتے ہیں اور ان پر سوچتے بھی ہیں، گذشتہ دنوں نعیم اظہر کے ساتھ میری ان مسائل پر گفتگو بھی ہوتی رہی ہے غالباً ہم دونوں اس پر بھی متفق ہوئے تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید میں برائی کی نفی سے یقیناً برائی کا پرچار مراد نہیں ہے۔ انسانی صورتحال کے لیے نیکی کا غلبہ اور برائی کی نفی ایسے دو اصول ہیں جن سے انسان کی تخلیقی صلاحیتوں میں قوتِ نمو آشکار ہوتی ہے۔ برائی کی نفی سے مراد برائی کی تشہیر سے گریز کرنا ہے۔ نعیم اظہر کے شعری رویوں میں ایسے اصول کی شناخت بڑی اہم ہے اور نعیم اظہر کے تخلیقی فہم کی انفرادیت بھی اسی میں ہے۔

۴۔ نعیم اظہر کا کہنا ہے انسان وہی کچھ بنتا ہے جو اس کے ارد گرد کی فضا اُسے بنانا چاہتی ہے۔ خیالات کو بدل دو، انسان بدل جائے گا۔ ایسے فکری رویے تصورات کی فضا سے تعلق رکھتے ہیں اور تصورات کی فضا میں جتنا تناسب شر کی حمایت کا دکھائی دیتا ہے۔ انسان اُسی نسبت سے شر کو اختیار کرتا نظر آتا ہے۔ نعیم اظہر اس اعتبار سے عہدِ حاضر کی ادبی کارگزاریوں سے مطمئن نہیں ہے۔ شاید اسی لیے اس نے اپنی غزل میں ایک بدلا ہوا رویہ اپنایا ہے مگر اس بدلے ہوئے رویے نے نعیم اظہر کی غزل کے لیے چند ایک دشواریوں کو نمایاں بھی کیا ہے۔ ان غزلوں میں کلاسیکی مزاج کی ہلکی سی گونج بھی سنائی دیتی ہے، غزل کا وہ رنگ نظر نہیں آتا جو عام طور پر عہدِ حاضر کی غزل کا تاثر بنتا ہے۔ زبان نثر کے قریب تر ہے اور جذبے اور قافیہ کے درمیان یکجائی کے سلسلے مربوط ہوتے شاید دکھائی نہیں دیتے۔ ان باتوں کو نعیم اظہر کی خامیوں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن حقیقت غالباً ایسی نہیں ہے۔

تاہم میری رائے یہ ہے نعیم اظہر نے اپنی غزل کو دانستہ ایسا غیر مانوس ناک نقشہ دیا ہے تاکہ ان حقائق کو آزمانے کی گنجائش ممکن ہو سکے جو اس کی نظر میں اپنی وضاحت کے طلبگار ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے نعیم اظہر کی غزل کے بعض اشعار اس نوع کا اختصار بھی حاصل کر پائے ہیں، جن کو 'قولِ اکابرین' کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ نعیم اظہر کی غزل میں الفاظ اپنی محسوساتی تاثیر کو صورتحال سے رہائی کے لیے بروئے کار لاتے ہیں۔ جو اپنے طور پر ایک قابلِ قدر بات ہے

میں نے اسی لیے پیش لفظ سے انحراف کرتے ہوئے نعیم اظہر کے مجموعے سے اشعار کو اپنے دلائل کی وضاحت کے لیے استعمال نہیں کیا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ زنانی کی غزلوں کے لیے ایک فکری پس منظر ضرور فراہم کرتا ہے۔ اس پس منظر کے بعد آپ نعیم اظہر کی غزل پڑھیں اور دیکھیں کہ شاعر نے اپنے قاری کو کس نئے راستے کی خبر دی ہے ۔۔۔۔ اس ایک رشتے میں نعیم اظہر کا شعری جواز بھی ہے اور ہمارے عہد کے ساتھ اس کی نسبت بھی ہے

جیلانی کامران

۲۷ رمضان المبارک ۱۴۱۰ ھ
۲۳ اپریل ۱۹۹۰ء لاھور

"چہرہ بہ چہرہ" سے "تریاق" تک کا سفر

"چہرہ بہ چہرہ" سے "تریاق" تک کا سفر دراصل مشاہدے سے واردات تک کے سفر کا دوسرا نام ہے۔ جسے نعیم اظہر نے ایک ایسے پُر مایہ مجادلے کے حوالے سے طے کیا ہے۔ جو اپنے اندر ایک پُراسرار قسم کی معروضیت (Objectivity) رکھتا ہے اور جسے اپنے حتمی تجزیے میں ایک مخصوص قسم کی موضوعیت (Subjectivity) قرار دیا جا سکتا ہے۔ معروضیت اور موضوعیت یا بے تعلقی (Detachment) اور تعلق (Attachment) کا یہ تال میل ایسا ہی ہے جیسا کہ "نا کاہو سے دوستی اور نا کاہو سے بیر" رکھنے والی شخصیت میں اس وقت جلوہ گر ہوتا ہے۔ جب وہ "سب کی خیر" مانگتی دکھائی دیتی ہے۔ سب سے بے تعلق رہتے ہوئے سب سے مربوط رہنا ایک ایسی صنفِ خاص ہے جو صرف انہیں فقیرانِ بے نوا کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے جو اپنے ذاتی مفادات سے بے نیاز ہو کر کائناتی بہبود کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے ہیں۔ نفیٔ ذات کا یہ عظیم روحانی کارنامہ انہیں اثباتِ کائنات اور اثباتِ خالقِ کائنات کے مقامِ محمود پر استوار کر دیتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ استواری جہاں عرفانِ ذات کا اعزاز بخشتی ہے۔ وہاں شعورِ کائنات کے حوالے سے معرفتِ خالقِ کائنات کا شرف بھی فراہم کرتی ہے۔ نعیم اظہر کی شاعری بھی اسی اعزاز و شرف کی آئینہ دار ہے اور اسی مقام کے حصول میں وہ تریاق پنہاں ہے۔ جس کی تلاش انسان کو ازل سے سرگرداں رکھے ہوئے ہے اور ابد تک سرگرداں رکھے گی اور اسی درخشاں حقیقت میں نعیم اظہر کی شاعری کے کمالِ ہنر کا راز مضمر

ہے۔ اس مقامِ محمود کا حصول جس جاں سپاری، شیفتگی، دردمندی، ایثار و قربانی اور انتہائی خودسپردگی کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے مظاہر ان کی ارفع و منزہ شاعری میں جابجا ملتے ہیں اور کیونکہ ہم ان کی شاعری کو جگ بیتی کی بجائے آپ بیتی کی روشن شہادت ٹھہرا سکتے ہیں۔ لہٰذا پورے اعتماد سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اپنے قارئین و سامعین کو اپنے بے پناہ تخلیقی بہاؤ میں ایک بے بس تنکے کی طرح بہا کر لے جانے کی بدرجہ اتم صلاحیت و قوت رکھتی ہے۔

ذات، کائنات اور خالقِ کائنات کی شناخت کے سہ گونہ مراحل طے کرتے ہوئے اس مقدس سفر کا مسافر ہمیشہ اس روحانی وراثت کی پناہ میں ہوتا ہے۔ جس کے فیضان کی اہمیت اور قطعیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ نعیم اظہر نے بھی اپنی ساری کی ساری مابعد الطبیعیاتی مسافت اس گرانقدر اور روحانی ورثے کی نہایت آسودگی بخش چھاؤں میں طے کی ہے تو یہ اظہارِ حقیقت بے جا نہ ہوگا۔ نعیم اظہر نے "تریاق" میں جس فنی مہارت، جمالیاتی پختگی اور ہنرمندانہ استقامت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے اس صداقت کا ادراک بھی ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے روحانی تجربات و واردات کو جمالیاتی سانچوں میں ڈھالنے کے سلسلے میں بھی نہایت قابلِ قدر ریاض کو کہیں بھی صرفِ نظر نہیں ہونے دیا اور یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا شعری صحیفہ "تریاق" ہمارے تمام انفرادی اور اجتماعی دکھوں کے زہر کا ایک ایسا "تریاق" بن کر منصۂ شہود پہ آیا ہے۔ جس کی قدر و قیمت کا صحیح تعین شاید عہدِ حاضر پورے طور پر نہ کر سکے اور یہ سعادت صرف مستقبل ہی کا مقدر ٹھہرے۔

عارف عبدالمتین

۲۶ر فروری ۱۹۹۱ء

دُعا

بس یہی التجا ہے ربِّ جلیل
تُو مجھے یاد زار زار آئے
ہُوں غلامِ محمّدِ عربیؐ
میرے حصّے یہی وقار آئے

فردیات

(حمدیہ)

رنج و غم سے نمو ملی ہے مجھے
تو بھی یا ربّ عظیم رازق ہے

○

قبول کر لیا تُو نے مکینِ دل ہونا
الٰہی میں تری رحمت سے اور کیا مانگوں

○

اتنا کم آمیز بھی اظہرؔ نہ ہو
تیرا خالق، تیرا مالک ہے جلیل

فردیات

(نعتیہ)

کچھ بھی نہیں ہے فردِ عمل میں مری تو کیا
وابستگی تو ہادیٔ اُمّیؐ لقب سے ہے

○

دل کے پُرنُور محلّات کو اے جانِ جہاںؐ
ہے یہ حسرت کہ ترے دائمی ڈیرے ہوتے

نعت

رنگ و رعنائیٔ تہذیب کا محور توؐ ہے
حسنِ اخلاق کے ہر روپ کا مظہر توؐ ہے
راہ معبودِ حقیقی کی دکھانے والے
مری مسجد مرا کعبہ، مرا سرور توؐ ہے
بخش دے دل کو مرے غارِ حرا کی صورت
جی ترستا ہے کہ دیکھوں مرے اندر توؐ ہے

دے گی کب راہ مجھے پیاسِ چمن کی مولا
میں ہوں قطرہ مری خواہش کا سمندر تو ہے

المدد سیّدِ انوار کہ ظلمت کم ہو !
نورِ ایمان بھی تو، ہادی و رہبر تو ہے

شر کی تکذیب دکھا ہم کو کہ جانے کب سے
خیر ہے پیشِ نظر جس کا پیمبر تو ہے

ہم گراں خواب ہیں سوتے ہیں زمانہ تج کر
نیند سے ہم کو جگا حاشرِ محشر تو ہے

نعت

جب مدح تری مظہرِ ابرارؐ کروں میں
ہر موئے بدن کیف سے سرشار کروں میں

بخشا تھا مجھے جو تری خوشبوئے دہن نے
اس علم کو پھر زینتِ افکار کروں میں

ہر سمت بڑھوں شورشِ باطل کو مٹانے
یوں جان و جگر برسرِ پیکار کروں میں

جس سمت بھی اُٹھیں مری مشتاق نگاہیں
اے رحمتِ عالم ترا دیدار کروں میں
پاؤں جو ترے قرب کا انمول خزینہ
اِک رقص سرِ کوچہ و بازار کروں میں

(ق)

پھر میرے تنِ خاک کو توقیرِ عمل دے
یوں خود کو عنایات کا حق دار کروں میں
پھر کوئی مجھے آتشِ نمرود میں پھینکے
پھر آتشِ نمرود کو گلزار کروں میں

نعت

مجھ پہ برسے ترے انوار رسولِ عربیؐ
مَیں ہوا دشت سے گلزار رسولِ عربیؐ

سارے عالم میں ترے پیار کی خوشبو پھیلی
تو کچھ ایسے ہوا گلبار رسولِ عربیؐ

ہر طرف پھوٹ بہے حُسنِ عمل کے چشمے
اتنا احسن ترا کردار رسولِ عربیؐ

جس کی پہچان سے ہوتی ہے خدا کی پہچان
نورِ فطرت کا وہ مینار رسولِ عربیؐ

میں سفینہ ہوں تری یاد کنارا میرا
اور یہ زیست ہے منجدھار رسولِ عربیؐ

ساری دنیا ہے تمنّائی زر و منصب کی
اور میں تیرا طلب گار رسولِ عربیؐ

مجھ سے برہم ہیں جو حالات تو کیا غم اظہرؔ
مرے محسن، مرے غم خوار رسولِ عربیؐ

میرے فن سے علم و حکمت کے خزانوں کو نہ ڈھونڈ
مجھ پہ جو کچھ بھی گزرتی ہے کہے جاتا ہوں میں

قطعہ

دیکھنا اُن کا قیامت ڈھا گیا
واردات طُور کو دہرا گیا
اِس قدر پھیلے وہ انوارِ جمال
میری دُنیا پر اندھیرا چھا گیا

عہد شکن

اس کا نام تھا میری امّی
جس سے میں نے عہد کیا تھا
امّی میں اب گھر گھر جا کر
اپنے دامن کو پھیلا کر
سب سے حاصل علم کروں گا
اپنا اِک کشکول بھروں گا
اور وہ تیری نذر کروں گا
امی تُو دنیا میں نہیں ہے
علم کا وہ کشکول بھی
اب تک خالی ہے
پھر بھی کچھ اشعار کی صورت
دردوں کے انبار کی صورت
میری آہوں اور نالوں نے
اپنا اِک اظہار کیا ہے

میں نے جسے تریاق کہا ہے
امی تُو جو زندہ ہوتی !
میں یہ تیرے پاؤں پہ رکھ کر
اتنا کہتا
امّی یہ سب لاعلمی ہے
علم نہیں ہے
پر تُم اس کو علم ہی جانو
امی میرا کہنا مانو
علم پہ کوئی بس نہیں میرا
مجُھ کو عہد سے فارغ جانو
شاید وہ مجُھ عہد شکن کو
بے بس جان کے بخش ہی دیتی
میرا کہنا مان ہی لیتی

○

ہم جب کبھی بھی رُوپ نگر سے گزر گئے
غازے نگارِ زیست کے رُخ سے اُتر گئے

دیکھا اِک ایک ذرہ وہاں خود تھا بے قرار
ہم جس جگہ بھی عشق کے زیرِ اثر گئے

اس منظرِ رواں میں کشش اس بلا کی تھی
رفتار اپنی دیکھ کے ہم خود بھی ڈر گئے

سوچا اسے تو وہ تھا فقط نکتۂ جبات
لائے اُسے بیاں میں تو معنی بکھر گئے

اس سیلِ آرزو میں جہاں تُندیاں نہ تھیں
ہم اپنے گرد آپ بناتے بھنور گئے

اظہرؔ جلا کے خود کو تری انجمن میں ہم
کچھ اہتمامِ جشنِ چراغاں تو کر گئے

○

جانے ہجر کی رُت کا مجھ پر کیسے آن ظہور ہُوا
کب میں خواب سے باہر نکلا، کب میں تجھ سے دُور ہُوا

بُنتا جاؤں پل پل اپنی پیار کتھا کو گیتوں میں
سوچ رہا ہُوں میں ہی آخر کیوں اس پر مامور ہُوا

کرچی کرچی نے بکھرائی درد کی سوندھی باس
جب سے اپنی آس کا شیشہ گر کر چکنا چُور ہُوا

کیسے اس کی رات کٹی ہے بھور بھئے تو جان سکوں
جس کی خاطر تن من اپنا سپنے سے سپند رہُوا

جو بھی بیتی، بیتی مجھ پر اس بے نام تمنا میں
میں جتنا مختار تھا، میرا دل اتنا مجبور ہُوا

برسوں پہلے میں بھی اپنے آپ کو ڈھونڈنے نکلا تھا
دھیرے دھیرے جانے کس پرچھائیں میں مستور ہُوا

اپنی تو بس دوڑ ہے اظہرؔ سانس کے آنے جانے تک
اس سے آگے جو پھر میرے سائیں کو منظور ہُوا

○

اے شوق مرے دل میں کبھی یوں بھی اُترنا
بن جاؤں میں تعمیر کی تدبیر کا جھرنا

آئی نہ کوئی بات مرے فہم کی زد میں
جب تک نہ ہُوا اس کا حقیقت میں گزرنا

یہ سوچ کے میں درد کی بھٹی میں پڑا ہُوں
اک روز ہے اس کاکُلِ گیتی کو سنورنا!

مل جائے گا مفہومِ محبت کو اُجالا
تو دردِ وفا میرے ہی سینے میں ٹھہرنا

ملتا ہے جہاں نقشِ جزا حرفِ دُعا کو
مارے ہوئے بیٹھا ہوں مَیں اس شہر میں دَھرنا

اک شمع جلائے ہوئے پھرتا ہُوں میں اظہرؔ
اب کام ہے کرنوں کا بکھرنا نہ بکھرنا

○

منزلِ جاں کو جہاں بھی کرب میرا چاہیے
اس کی ہر جانب فروزاں حُسن تیرا چاہیئے

اے شبِ ہجراں بہت ہی خوب ہے وسعت تری
پھر بھی اس میں کوئی تو داغِ سویرا چاہیئے!

بے ستوں اُمیّد کے محلوں میں جینا ہے محال
اب کہیں دامانِ رحمت میں بسیرا چاہیئے

جس کی دم سازی سے ہر سُو پیار پر آئے بہار
اب تو اس جوگی کا ان گلیوں میں پھیرا چاہیئے

کون آئے گا یہاں اس چلچلاتی دھوپ میں
لُطفِ باراں دے نہ دے بادل گھنیرا چاہیئے

چاند چمکے گا کہاں، کیسے ستارے دیں گے لَو
انکشافِ نور کو تو اک اندھیرا چاہیئے

جس کی ہر شاخِ شجر تیری مہک ارزاں کرے
اب تو اس جنگل میں اظہرؔ اپنا ڈیرا چاہیئے

○

مری وفا پہ غضبناک کب سماج نہ تھا
یہ اور بات مرے لب پہ احتجاج نہ تھا

میں کیسے کرتا محبّت کے راستوں سے گریز
میں تیرا حُسنِ نظر تھا، ترا مزاج نہ تھا

تھا اپنا ظرف وہاں بھی مرّوتیں بانٹیں
وہ شہر جس میں محبّت کا کچھ رواج نہ تھا

تری نظر کو مسیحائی کی نہ تھی فرصت
وگرنہ میرا مرض اتنا لاعلاج نہ تھا

نہ جانے کیوں یہ اندھیرا نہیں چھٹا اظہرؔ
کچھ اتنا دُور شبِ غم سے وہ سراج نہ تھا

فردیات

آبروئے سُخن بحال رہے
جان اپنی کی خیر ہے بابا

○

میں اپنی کھوج میں نکلا تو یہ ہُوا معلوم
ہوں جس کا عکسِ تصوّر وہ میرے دل میں ہے

○

جس کو کہتا ہوں اپنا آپ اظہر
وہ مِرے تن بدن سے باہر ہے

تراشا جب کسی بھی خـال و خد کو
مرتّب ہو گئی تصویر تیــری

○

ہر شب، شبِ وصال ہے، ہر دل دلِ گداز
تو جس میں اپنی قامتِ شیریں انڈیل دے

○

میں کیسے بھول سکوں گا تجھے کہ تیرا خیال
مہک رہا ہے مرے دل میں موتیے کی طرح

○

نغـمگی بے سبب نہیں بکھری
رُوح کا تار تار کانپ گیا

○

مان لیتا ہُوں کہ اس کا سامنا ہو جائے گا
اَبر ہے مجھ کو بھگو کر وہ ہوا ہو جائے گا

چھوڑ جائے گا وہ اک یادوں کا سیلاب ِ بلا
اور اس میں ڈوبنا لازم مرا ہو جائے گا

میں غبارِ آرزُو ہوں میری منزل ارتقا
رک گیا تو جانِ جاں محشر بپا ہو جائے گا

اے مری نازک تمنّا! کیا نہ تھی تجھ کو خبر؟
بس یہاں جس کا چلے گا وہ خدا ہو جائے گا

اشکِ غم سے سینچتے جاؤ زمیں کو دوستو!
سرد رُت جائے گی تو پودا ہرا ہو جائے گا

ہاتھ میرے وقت کے ناسور تک جانے تو دو
وہ بھی جل کر عشق میں داغِ وفا ہو جائے گا

چونک اٹھا ہے زمانہ کرب میرا دیکھ کر
حال تو بھی پوچھ لے تو کیا بُرا ہو جائے گا

ہر قدم سے آ رہی ہے بیڑیوں کی سی کھنک
لوگ تو کہتے تھے اظہر اب رہا ہو جائے گا

○

تجسّس دل میں کیوں گھر کر گیا ہے
وہ مجھ پر کیا اُجاگر کر گیا ہے

وہ دلبر تھا، کہ دل آرا تھا، کیا تھا
عجب سے غم کے تیور کر گیا ہے

سفر اس کا مرے احساسِ جاں کو
تلاشِ حق کا خوگر کر گیا ہے

یہ کیا کم ہے کہ دل کو تاب دے کر
نئی سوچیں منوّر کر گیا ہے

وفورِ غم / خوشی سے تیر، اس میں
وہ اس دل کو سمندر کر گیا ہے

کہیں تو کام آ جائیں گے اظہر
وہ نذرِ دل جو گوہر کر گیا ہے

○

دل کے دیپک کو جلائے رکھنا
صبح تک خود کو جگائے رکھنا

بھول جانا مجھے لیکن دل کو
میری یادوں سے سجائے رکھنا

لوگ اُلفت بھی چرا لیتے ہیں
ضبط میں ربط چھپائے رکھنا

دل کی دیوار سے پلٹے شعلو
ایک تصویر بچائے رکھنا

یاس کی دھوپ نہ رستہ کاٹے
خود پہ اُمید کے سائے رکھنا

ولولے ذوقِ ہنر بخشیں گے
سر کو سینے پہ جھکائے رکھنا

خامشی موت ہے فن کی اظہر
حشرِ آواز اٹھائے رکھنا

○

خود سے باہر بھی اب سفر کر لیں
دوریوں کو قریب تر کر لیں !

آؤ ! اس جشنِ آرزو کے طفیل
جاگتے جاگتے سحر کر لیں

وہ جو رستہ طویل لگتا ہے
عین ممکن ہے مختصر کر لیں

نخلِ ہستی اُداس ہے کب سے
اس کی ہر شاخ باثمر کر لیں

خون ٹپکا ہے کچھ ارادوں سے
اس سے تزئینِ بال و پر کر لیں

وقت بخشے جلا تو کیا معلوم
کوہِ آشوب کو بھی سر کر لیں

اک جزیرے میں قید ہے اظہر
اب اسے اپنا ہم سفر کر لیں

○

آئینِ مروّت کو روا کر کے تو دیکھو
کچھ عرصہ محبّت کو خدا کر کے تو دیکھو

شاید تمہیں مل جائے مرے خواب کی تعبیر
تم در پہ نگاہوں کے صدا کر کے تو دیکھو

ڈھل جائے گا ہر رنگ مرا رنگِ وفا میں
احساس کی آنکھیں کبھی وا کر کے تو دیکھو

مہکار صداقت کی بکھر جائے گی ہر سُو
ہم خاک نشینوں کو صبا کر کے تو دیکھو

شاید اسی صحرا میں اُگے کشتِ وفا بھی
مچلے ہوئے جذبوں کو گھٹا کر کے تو دیکھو

اے میری مسافت کا نشہ چھیننے والو
ناخن کبھی پوروں سے جُدا کر کے تو دیکھو

اسرارِ شبِ وصل کے کھُل جائیں گے اظہرؔ
تم حرفِ محبّت کا ادا کر کے تو دیکھو

○

کہیں میں نے جب بھی چاہی تری راہ تک رسائی
وہیں بے دریغ پہنچا ترا حکم اِتنا عی

ہے تضاد فطرتوں میں تو بنے گی بات کیسے
میں نشیب چاہتوں کا، تو فرازِ نارسائی

مٹیں دُوریاں تو کیونکر کہ ہے خوئے چارہ سازاں
یہاں میری ہم خیالی، وہاں تیری ہمنوائی!

تیری طرفہ بے حِسی پر اسی سوچ میں ، مَیں گُم ہُوں
میری تابکارِ فطرت یہاں کام کیوں نہ آئی

چلو شعلۂ جنوں ہی ذرا تیز کر کے دیکھیں
یوں ہی کچھ فزوں ہو شاید تب و تابِ آشنائی

یہ وفا گزیدہ اظہرؔ کبھی کاش جان پائے
میرے دکھ سے کیوں نہ گزرے مری رہبری کے داعی

فردیات

جن آنکھوں میں ہو عشرتِ فردا کا بسیرا
گزرے ہوئے لمحوں کا وہ نوحہ نہیں کرتیں

○

یقیں ہے دل کو کہ اب بھی ہے تو قریب مرے
مگر نگاہ نہ مانے تو کیا کہوں اس کو

○

رچ بس گیا ہوں تیرے تصوّر میں اس قدر
پیغام ہے قضا کا یہ اذنِ سفر مجھے!

○

ٹھوکر لگی ہے جب بھی تمنا کی راہ پر
میں لڑکھڑا کے بحرِ تفکر میں جا گرا

○

خزاں نگر سے جو گزرو تو یہ خیال رہے
جنم بہار کا اس آستاں سے ہوتا ہے

○

میں تیرے پیار کا ممنون ہوں کہ جس کے طفیل
زمانے بھر کے دکھوں نے مری کفالت کی!

○

چھاننے دے خاکِ منزل، بند دروازہ نہ کر
حسرتوں پر ہی مرا موقوف شیرازہ نہ کر

یہ محبت کا سفر ہے جانِ مَن طے کر اسے
جلوہ ہائے شوق کو مرہونِ خمیازہ نہ کر

خود شناسی چاہیئے تو دہر سے نظریں ملا
اپنے اندر کی ہوس سے اپنا اندازہ نہ کر

تیری منزل ہے سحر، تو تیرگی کی موت تک
جان جاتی ہے تو جائے ترک آوازہ نہ کر

آبروئے فن کی خاطر تو شبیہِ ذات کو
رنگ! یا بیرنگ کر لیکن نہِ غازہ نہ کر

تو مسیحا ہی نہیں اظہرؔ تو پھر یہ زخمِ جاں
مندمل کیا ہو، غنیمت ہے اسے تازہ نہ کر

خدشہ

یہی قسمت تھی مری جان یہی ہونا تھا
مجھ کو کھِلنا تھا سرِ شاخ کسی گُل کی طرح
تجھ کو خوشبو کی طرح مجھ سے بچھڑ جانا تھا
غم کی بجلی کو تو گرنا تھا کہیں بھی گرتی
میں نہ جلتا تو کسی اور کا خرمن جلتا
میری مہجور تمنا کفِ افسوس نہ مل
ان اندھیروں کو ضرورت تھی مرے شعلوں کی
ہاں مگر

جب بھی تیری یاد ستاتی ہے مجھے
کوند جاتی ہے تصوّر میں ترے پیار کی برق
دیکھ کر ابرِ جفاکیش کو منڈلاتے ہوئے
ایک خدشہ
مرے احساس کو ڈس جاتا ہے
کہیں بے سود نہ جائے مری حدت کا خروش
جس میں مہتاب ہے رقصیدہ مرے ماضی کا
جس پہ موقوف ہے خورشید مرے فردا کا

O

اضطرابِ شوق کی وارفتگی اچھی نہ تھی
حُسن کے پندار میں بھی خودسری اچھی نہ تھی

اے جمالِ یار! تیری ہر ادا دل کش مگر!
اپنے غم خواروں سے اتنی بے رُخی اچھی نہ تھی

کیسے کہہ دُوں، جب اُسی کے دم سے پایا ہے فروغ
تیری چاہت میں جو گزری زندگی اچھی نہ تھی

محفلِ حسن ونظر سے وادیٔ ادراک تک
تھا سفر اچھا مگر تیری کمی اچھی نہ تھی

پارہ پارہ کر گئی ہے سب سہانے ولولے
شہرِ جاں سے اس قدر وابستگی اچھی نہ تھی

تیری دنیا سے خیال و خواب تو اچھے ملے
اپنے بارے میں جو پائی آگہی اچھی نہ تھی

شدّتِ غم سے ہوئے بے حال تو اظہر کھلا
کرب کے اظہار سے پہلو تہی اچھی نہ تھی

ریا کچھ بیج ایسے بو گئی ہے
کہ مٹی پانی پانی ہو گئی ہے

یہ برکھا تھی کہ جانے کیا بلا تھی
وفا کے رنگ و روغن دھو گئی ہے

کہیں کیا وحشتِ جاں سے کہ وہ بھی
تمنّاؤں کو تج کر سو گئی ہے

فروغِ جستجو تو ہی بتا دے
کہاں تیری فضیلت کھو گئی ہے

جمالِ یار پھر جلوہ نما ہو!
تمازت عشق کی کم ہو گئی ہے

بہا کر لے گئے ہیں پستیوں کو
یہ رونے بے بسی کیا رو گئی ہے

اُٹھو اُٹھ کر نئی راہیں کریدیں
تلاشِ حق ضروری ہو گئی ہے

○

وہ اس سے پہلے نہ تھا میرے آشناؤں میں
جو قہر اب ہے مری موسمی ہواؤں میں

اُڑا ہے جب سے فضاؤں میں آس کا پنچھی
گرج رہی ہیں عجب بجلیاں گھٹاؤں میں

مٹاؤں کیسے تصوّر سے اس کا عکسِ جمیل
پلا ہوا ہوں میں جس آرزو کی چھاؤں میں

میں اُن سے لوٹ کے آؤں یہ اب نہیں ممکن
اُتر چکا ہوں بڑی دور کی صداؤں میں

ہجومِ شوق، غمِ بے بسی، مآل کی فکر
بسے ہوئے ہیں کئی شہر میرے گاؤں میں

یہ آرزو ہے اڑوں ان میں راکھ کی صورت
جلا ہوں پیار کی جن آتشیں فضاؤں میں

نہ جی سکوں گا بچھڑ کر میں گل کی خوشبو سے
بچھا دو خار کہ چبھ جائیں میرے پاؤں میں

فردیات

تری نگاہ نے بخشا تھا جو سُرور مجھے
ترے بغیر بھی اس سے نبھا رہا ہوں میں

○

جس سمت بھی گیا ہُوں تری ذات کے طفیل
خود اپنی راہ آپ بنا کر گیا ہوں میں

○

بکھر رہا ہوں میں جس کے طفیل گلشن میں
خدا کرے کہ وہ ہو تیری آرزو کی بہار

○

چاند اس کو کہیں تو کیسے کہیں
اس کی یادوں میں ہے تپش اب بھی

○

ڈھونڈتا پھرتا ہے جس کو دربدر تُو دہر میں
اپنی فطرت کے نہاں خانے میں بھی اس کو ٹٹول

○

لکیریں دیکھ کے ہر روز اپنے ہاتھوں کی
بزعمِ دست شناسی میں ڈھونڈتا ہُوں تجھے

○

ہو گئے سب فیصلے حرفِ گریزاں میں اسیر
اپنے منصف کی نظر میں جب بھی میں پرکھا گیا

○

جب کوئی عہد نہ پیماں ہوگا
کرب کس طور فراواں ہوگا

رنگِ محفل تو بچھڑنے تک ہے
پھر یہاں کون گریزاں ہوگا

تیری راہوں سے گزرنے والا
کیا سدا گرد بداماں ہوگا

ق

عیب کو زینتِ اظہار نہ دے
اس سے ہر خواب پریشاں ہو گا

تیری اس نقش گری سے آخر
کون سے درد کا درماں ہو گا

دل کے انکار سے مایوس نہ ہو
آخرش یہ بھی مسلماں ہو گا

○

غم کے شعلوں کو ہوا دے اظہرؔ
راستہ کچھ تو نمایاں ہو گا

○

ہر آرزو یوں کیفرِ کردار تک گئی
مٹی اُڑی جو پاؤں سے دستار تک گئی

نقش و نگارِ صبحِ تمنّا کی جستجو
اب تک تو صرف روزنِ دیوار تک گئی

آخر وہ کیا فسوں تھا کہ جس کی تلاش میں
ہر سعئ فکر کاوشِ بیکار تک گئی

ماحول پر عجیب کثافت کی دھند تھی
کوئی کرن نہ وادیِ افکار تک گئی

اُس عہد تک ہیں ساری مسیحائیاں فضول
جب تک دوا نہ دستِ طلبگار تک گئی

اظہرؔ نہ پوچھ ہم سے محبّت کی داستاں
اک تشنگی سی تھی کہ جو اظہار تک گئی

○

خوشیوں میں کھوج ہے نہ نشاں تک غموں میں ہے
لگتا ہے میری راکھ کہیں خواہشوں میں ہے

تقسیم کیا کروں میں زمانے میں دوستو
عنقا صفت ہے وہ جو میرے حاصلوں میں ہے

رفتار تھم گئی ہے نہ جانے صبا کی کیوں!
شاید کہ میرا ذکر ابھی گلشنوں میں ہے

اے دردِ ! کچھ تو لوحِ محبّت کو کر عیاں
کہتے ہیں پھر وہ چشمِ فسوں داستوں میں ہے

ٹوٹا ہُوں جس کے عکس کی رعنائیوں سے میں
تصویر اس کی اب بھی مری کرچیوں میں ہے

طوفان پر اُبھار رہی ہے وہی مجھے !
اِک مستقل گھٹن جو مرے ساحلوں میں ہے

جن جنگلوں میں تجھ کو ڈسے جا رہے ہیں سانپ
تریاق زہر کا بھی انہی جنگلوں میں ہے!

اظہر نہیں ہے کیوں ترا پیکر شرر نشاں
جب آگ تیری روح کی گہرائیوں میں ہے

○

تیرے ملن کی سوچ سے تھرّا گیا ہُوں میں
لگتا ہے اپنے آپ سے ٹکرا گیا ہوں میں

کیسے کہوں اُسے کہ کرے خنکیاں عطا
شعلوں میں جس کے ہاتھ سے پھینکا گیا ہوں میں

بھڑکا ہے اس قدر مرا احساسِ تشنگی
آنکھوں میں جتنے اشک تھے برسا گیا ہوں میں

نظریں ملا، کہ ڈھونڈ لوں شاید کوئی جواز
ہر زاویے سے کس لیے توڑا گیا ہوں میں

ممکن نہیں ہے لوٹنا اب شہرِ درد سے
شاید گزر کے جاں سے یہاں آ گیا ہُوں میں

اظہرؔ نہیں ہے مجھ میں اگر پیار کی مہک
پھر زیرِ غور کس لیے رکھا گیا ہُوں میں

"نئی بنیاد"

تلاش اس کی اگرچہ کُو بکُو کی
بنی کب بات کوئی آرزُو کی
اگر پرکھیں تو رائج ضابطوں میں
کہاں ہے تاب زخموں کے رفو کی
تدبّر کے بہلو میں یہ بھی سوچیں!
ڈگر کیا بن چکی ہے گفتگو کی

مسائل کا سعزاداری نہیں حل
تفکّر راہ ہے اس آب جُو کی
حقیقی حل تو ہے نافذ ہو قرآں
ابد تک عمر ہے جس چارہ جُو کی
حروفِ لاالٰہ تو کہہ رہے ہیں
روایت سے لڑیں صورت عدو کی
لکیریں کھینچ کر پچھلے کیے پر
نئی بنیاد رکھیں جستجو کی
نظامِ زندگی کی سب رگوں میں
حرارت پھونک دیں تازہ لہو کی
مدینے جا اٹکنا دل کا اظہر
غموں کو دے گا صورت سرخرو کی
خدایا! دے ہمیں یہ عزم و ہمّت
کمر ہی توڑ دیں مُلّائی خو کی!

○

ہم قدم تو ہے تو آسان سفر بھی ہو گا
کوہِ آشوب اسی کیف میں سر بھی ہو گا

حبس کہتا ہے مرے دل کی فضاؤں کا مجھے
کسی طوفان کا سہرا مرے سر بھی ہو گا

ابر اُٹھے گا جو برسوں کی کثافت دھونے
اس میں شامل مرا خونابۂ تر بھی ہو گا

میرے ماحول کی خوشبوؤں کا جو ضامن ٹھہرے
دکھ کی دیوار میں اک روز وہ در بھی ہو گا

خواب بن کر مری سوچوں میں سنورنے والے
کیا حقیقت میں کبھی تیرا گزر بھی ہو گا

سنگدل اس کو کہوں کیوں، کہ خبر ہے مجھ کو
دل سے اُٹھیں گے جو نالے تو اثر بھی ہو گا

سینچتے جاؤ زمیں خونِ جگر سے اظہر
شاخِ امید پہ اک روز ثمر بھی ہو گا

○

دل جب کبھی بھی دشتِ طلب کو سجا گیا
اک وحشتِ مزید سے پردہ ہٹا گیا

سوچا گیا نہ اپنے حوالے سے پھر کبھی
تیری گلی میں اے مرے محسنؔ میں کیا گیا

گُل کی طرح سے کھل کے اُمنگوں کے دشت پر
اک شخص میری راہ میں کانٹے بچھا گیا

سویا ہوں جب بھی فکر کے لمحوں کو تج کے میں
شدّت سے وہ خیال میں آ کر جگا گیا

سب عکس اس کے حسن کی رعنائیوں کے ہیں
جو کچھ بھی مجھ سے شعر کی صورت کہا گیا

بجھنے لگا ہے جب بھی کوئی آس کا چراغ
اے یادِ یار! میں ترے نرغے میں آ گیا

منسوب گو نہیں تھے غزل سے معاملات
میں پھر بھی اس کی شوخ نوا میں سما گیا

اظہرؔ وہ جس کی یاد کا خوگر ہوا ہے دل
مجھ سے کوئی بھی وصف نہ اس کا لکھا گیا

○

وہ مجھ میں رہتے ہوئے مجھ سے ماورا کیوں ہے
وجود رکھتے ہوتے بھی وہ خواب سا کیوں ہے

ترا جمال حقیقت کے خواب دے کے مجھے
خیال بن کے سرابوں میں کھو گیا کیوں ہے

وہ روشنی جسے کہتی ہے پیار یہ دُنیا
مری حیات سے آخر گریز پا کیوں ہے

گریں گی اور بھی کیسا بجلیاں تمنّا پر !
دیارِ صبر پہ بادل جُھکا ہوا کیوں ہے

بہا تو دی تھی مری راکھ میرے اشکوں نے
جو میں نہیں ہُوں تو پھر سیلِ ابتلا کیوں ہے

لگا گیا ہے کوئی تن بدن میں ہجر کی آگ
نہ جانے پھر مرا چہرہ بُجھا بجھا کیوں ہے

ہجومِ شوق میں یہ بے بسی ہے کیوں اظہر
وفا کے شہر میں یہ حشر سا بپا کیوں ہے

○

وہ مری منزل بھی ہے اظہرؔ مری منجدھار بھی
جس کا پیکرِ نور بھی ہے پردۂ اسرار بھی

ہو چکا ہوں خواب پھر بھی یاد ہے اتنا مجھے
زندگی میں آئی تھی اک ساعتِ بیدار بھی

مجھ کو ہر لمحہ اسی کے خواب میں رہنا پڑا
جس کی یادیں چین بھی ہیں درد کا انبار بھی

دل سراپا آگ ہے اور آنکھ میری اشک بار
گا رہا ہے یہ بدن دیپک بھی اور ملہار بھی

یہ مرا عالم نہ جانے مجھ کو لے جائے کہاں
درخورِ زنجیر بھی ہوں برسرِ پیکار بھی!

حرف کے پیکر میں ڈھلتی ہی نہیں جذبے کی آنچ
شعر کہتا ہوں مگر ہوں تشنۂ اظہار بھی

جانے کیا صورت مجھے بخشے گی یہ تصویرِ شوق
ہاتھ میں کشکول بھی ہے سر پہ ہے دستار بھی

کب سے تن پر جھیل رہا ہوں سپنوں کی برساتوں کو
کس کی خاطر جاگ رہا ہوں یوں وحشت میں راتوں کو

میں تو بس اِک اپنے من کی آگ بجھانے نکلا تھا
جانے کیسے جگ کے دُکھڑے بھا گئے میری گھاتوں کو

ہر بندہ ہے سُکھ کا طالب، ہر گھر میں خوشیوں کی مانگ
ایسے میں اب کون سُنے گا درد میں لتھڑی باتوں کو

میں بھی شاید جگنو بن کر چمکوں گا اندھیاروں میں
سر سے روز گزرتے دیکھوں تاروں کی باراتوں کو!

آ جا میری صبح کی صورت! پھر سے کر زنجیر مجھے
بکھرا بکھرا، اُلجھا اُلجھا ہوں میں پہن کے ذاتوں کو

جس کی خاطر شعر کہے تھے اس کو نہیں یہ بھائی بات
اب میں کس کے سامنے رکھوں ان بے کل سوغاتوں کو

تو بھی لمبی تان کے سو جا، چھوڑ دے چھوڑے والی بات
میں بھی اظہر جیت سمجھ کر بھول گیا ہوں ماتوں کو

○

خوابِ ہستی ٹوٹ کر جب بھی بکھر جاتا رہا
تیرا آنگن میرے ریزوں سے سنور جاتا رہا

اس طرح کٹتے گئے ہیں زندگی کے ماہ و سال
جیسے ہر لمحہ اُتر کر مجھ میں مر جاتا رہا

مرحلہ قُربت کا تھا یا دوریوں کا سانحہ
میں بہر صورت قیامت سے گزُر جاتا رہا

شبنم افشانی کی مہلت مجھ کو کانٹوں نے نہ دی
میں تو ہر گل کی طرف با چشمِ تر جاتا رہا

اس کی ہر قربت میں پنہاں تھا نیا اِک فاصلہ
پھر بھی ہر دوری سے وہ دل میں اُتر جاتا رہا

کس طرح کٹتی گئی تیرے بغیر اظہرؔ نہ پوچھ
وقت کو آخر گزرنا تھا گزر جاتا رہا

فردیات

اظہرؔ متاعِ صبر و تحمّل کی خیر مانگ
ماحول کے لبوں کو لہُو ہے لگا ہوا!

○

ڈوبنا ہر شے میں تھا اپنا نصیب
تیرنا آیا نہ ہم کو عمر بھر

○

میں جی رہا ہُوں اب اس شہر میں جہاں اظہرؔ
ہر ایک سانس مرے واسطے پہیلی ہے

پیار کے رنگ سے روشن تھے خد و خال مرے
کاش تو خود کو تماشائی کی صورت دیتا

○

ہمّت ہے تو جی لے اسی منجدھار میں اظہرؔ
دریائے محبّت کا کنارا نہیں ہوتا

○

ڈھانپتا رہتا ہُوں اپنی آگ خاکِ صبر سے
یہ بھڑک اُٹھی تو جسم و جاں سبھی جل جائیں گے

○

آ ذرا اس جذبۂ اُلفت کا سہارا لے کر
پھر سے تعمیر کریں شہرِ مسیحائی کو

اب آئے یا نہ آئے حقیقت نمود پر
میں سہہ چکا ہوں خواب کے پتھر وجود پر

صحرا کے تن پہ گرمئ اُلفت کی ہے جلا
بکھرا گیا ہے کون مجھے ان حدود پر

مجھ کو بجھا دیا تو زمانے پہ یہ کھُلا
خوشبو کا انحصار تو تھا جلتے عود پر

تھمتے نہیں ہیں اشک تو اب سوچتا ہوں میں
کیوں ابر کا گماں نہ ہوا مجھ کو دود پر

لاؤ نہ میری ذات ابھی میرے رُو برُو
احساس منحصر نہیں تن کے شہود پر

آ جاؤ سامنے کہ درِ جستجوُ کھُلے!
اس زلیست کا مدار نہیں ہے جمود پر

مانا کہ آسماں نہیں اظہر زمیں ہوں میں
پھر کیوں سجا رہا ہوُں ستارے وجود پر

میرے وطن

ترے سکوں کے لیے میں اضطراب بنوں
ترے عدو پہ گزرتا ہوا عذاب بنوں

وہ سائباں جو اماں دے ترے مکینوں کو
دعا ہے اس کی فضیلت کی میں نصاب بنوں

جہاں میں تیری وجاہت کی جو ضمانت ہے
تری کتابِ مقدس کا ایسا باب بنوں

میں تیرے کھیتوں کو شادابیاں کروں ارزاں
ترے لیے کبھی جہلم کبھی چناب بنوں

مرے وطن! تری روشن حیات کی خاطر
میں تیرا چاند بنوں، ترا آفتاب بنوں

مرزا غالب کی نذر

غم کا انداز جارحانہ ہُوا
تیری پہچان ہی بہانہ ہُوا

کس کی جانب نہ ہاتھ پھیلائے
کون ہم سے گریز پا نہ ہُوا

بارشِ سنگ اور ترا رستہ
سانحہ کب یہ رُونما نہ ہوا

بار ہا سچ کو لا کے ہونٹوں تک
زہر پینے کا حوصلہ نہ ہُوا

جھوٹ یہ بھی نہیں کہ جاں سے گئے
یہ بھی سچ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

نذرِ غالبؔ ہے میرا رنگِ سخن
جس کے پائے کا دوسرا نہ ہُوا

علامہ اقبالؒ کے حضور

اپنی ہر جانب اگرچہ آئینہ رکھتا ہوں میں
پھر بھی اپنی ذات کو خود سے ورا رکھتا ہوں میں

فن کی دنیا میں ترے غم کی پذیرائی رہے !
اپنے ہونٹوں پر یہی حرفِ دُعا رکھتا ہوں میں

حسرتیں، ارمان، چاہت، ولولے اور اضطراب
اس کی خاطر دیکھ کیا کیا ہم نوا رکھتا ہوں میں

کرب کی صورت تری راہوں کی حسرت کے سوا
دل کے ویرانوں میں آخر اور کیا رکھتا ہوں میں

میں یونہی سر و چراغاں کی طرح جلتا نہیں
تیری کرنوں سے کوئی تو رابطہ رکھتا ہوں میں

کاوشیں بیکار جائیں، یا رہے منزل بعید
صرف اندازِ تجسس کو روا رکھتا ہوں میں

اے ہوائے درد! کہہ دینا مرے اقبالؔ سے
تیرے غم میں جاگنے کا سلسلہ رکھتا ہوں میں

میری منزل سے کہو آئے مدارِ دید پر!
اب تو دکھ سہنے کا جی میں حوصلہ رکھتا ہوں میں

مجھ کو تکمیلِ سفر سے کوئی نسبت ہی نہیں
نام ہر منزل کا اظہر مرحلہ رکھتا ہوں میں

فیض احمد فیضؔ کی رحلت پر

خود کو یوں پیکرِ تصویر کیا ہے تُو نے
ایک عالم کو گلوگیر کیا ہے تُو نے

دردِ انساں تھا کہ تھا راہِ محبّت کا جنوں
جو بھی پایا وہ ہمہ گیر کیا ہے تُو نے

مدّتوں ڈھونڈیں گے ہم اس کی تمازت کے نقوش
فن کو جس سوز سے تطہیر کیا ہے تُو نے

دے گا اک عصر کو وہ حسنِ فراست کا شعور
جو محل شعروں سے تعمیر کیا ہے تُو نے

کون کہتا ہے یہ آہو نہیں قابو آتے
جذبہ و فکر کو زنجیر کیا ہے تُو نے

فیض تُو زندہ ہے پائندہ رہے نام ترا
زیست کو حاملِ توقیر کیا ہے تُو نے

ایک اظہر ہی نہیں ہے ترے غم سے گھائل
پُورے اس عہد کو نخچیر کیا ہے تُو نے

○

اچھا ہوا کہ خلقِ خدا پر عیاں نہ تھی
ورنہ شکستگی مرے اندر کہاں نہ تھی

پلکوں پہ آ گئے ہیں ستارے سے کس لیے
منزل مرے جنوں کی کبھی کہکشاں نہ تھی

قدغن ہے بزم پر کہ مرے غم کا سحر ہے
اس درجہ خامشی کبھی پہلے یہاں نہ تھی

ملنا پڑا ہے موجِ حوادث سے بارہا
لیکن کہیں بھی ذات مری درمیاں نہ تھی

کیوں رکھ سکی نہ بزمِ تمنّا کی آبرُو!
بے کیف اس قدر تو مری داستاں نہ تھی

اظہرؔ ذرا سی دل کو تشفّی ہوئی ضرور
ورنہ فصیلِ صبر مِری پاسباں نہ تھی

○

دل ہی اب خوگرِ ثنا ٹھہرے
عشق اپنا بھی باصفا ٹھہرے

سطوتِ حسن کچھ بعید نہیں
اپنے غم میں جو حوصلہ ٹھہرے

تیرا پرتو سبھی نے دیکھا ہے
کیا ہوا؟ ہم جو مبتلا ٹھہرے

عزم و ہمت دکھا مسیحائی
درد یونہی نہ لا دوا ٹھہرے

اب تو راہِ عمل میں اے مالک
اپنی رہبر، تری رضا ٹھہرے

کٹ رہی ہے اسی تمنا میں
اپنے آنگن میں بھی جلا ٹھہرے

کارگاہِ حیات میں اظہر
ہم جو ٹھہرے یونہی تو کیا ٹھہرے

○

جب سے ہوئی ہے عشق سے فرصت عطا مجھے
دشنام ہے یہ عالمِ برزخ نما مجھے!

ٹوٹے فسونِ شوق تو شاید کُھلے یہ بھید
کیوں جاں سے بھی عزیز ہے یہ ابتلا مجھے

شامل نہ جس میں ہوں ترے گلشن کی نکہتیں
صرصر سے کم کہاں ہے وہ بادِ صبا مجھے

اے بحرِ درد تُو ہی بتا موج موج کیوں
ساحل دکھائی دیتا ہے پاتال سا مجھے

سوچا نہ تھا کہ راہِ تنگ و دو پہ آ کے بھی
کرنا پڑے گا صبر پہ یُوں اکتفا مجھے

ہر ایک شخص کا مری گردن پہ ہاتھ تھا
مانگوں تو کون دے گا مرا خوں بہا مجھے

کیا جانے کیا ہوئے مرے بے نام سے سجود
اے خاکِ سجدہ ریز تو ہی کچھ بتا مجھے

پوچھا ہے جب بھی اظہرِ رنگیں سے اپنا رنگ
اس نے وجودِ دردِ تمنّا کہا مجھے!

○

پرواز کے جنوں میں اڑیں دھجیاں مگر
ہو تو گئے ہیں عالمِ امکاں میں معتبر

چاہت کی آگ دل میں بھڑکنے کی دیر تھی
سیراب کر گئیں مری آنکھیں کئی نگر

ہر برگِ گُل سے اُٹھی ہے تیرے بدن کی باس
بادِ صبا نے یوں تری آمد کی دی خبر

اس کارواں کا شور ستاروں میں کھو گیا
سننے کو جس کی چاپ ترستے تھے بام و در

لو دے رہا ہوں اپنی بجھی خواہشوں کو میں
کرنوں کو کب سے تیرے تصوّر میں ڈھال کر

اظہرؔ سراغ اپنا کہیں بھی نہ مل سکا
ہر آرزو کو میں نے ٹٹولا ہے عمر بھر

○

سوچتا ہوں وقت کیا یونہی گزرتا جائے گا
ان گھٹن کے موسموں سے دِل مفر کب پائے گا

کون جانے شہرِ گویائی کو خاموشی کا رقص
اپنی زہریلی ادا سے کب تلک برمائے گا

آگہی جب تک رہے گی خواب بُن لینے کا نام
ہر کمالِ معتبر، نامعتبر کہلائے گا

اے مرے شوقِ عمل! راہِ عمل تک بھی تو آ
دشتِ فرصت میں کہاں تک تو مجھے بہلائے گا

ہر کوئی رہبر لگے ہے، میں اکیلا راہ رو
سوچتا ہوں کون میری گتھیاں سلجھائے گا

میرے خوابوں کی حسیں تعبیر ہے جس کا وجود
وہ کبھی تو اوڑھ کر صبحِ مسرت آئے گا

تُو تو جل اُٹھا ہے اظہرؔ روشنی کے واسطے
حسرتوں کا یہ دُھواں اب کیا تجھے گہنائے گا

فردیات

ڈھونڈنا ہر اک نظر کا عیب کو
ہر رگِ خوبی کو اوجھل کر گیا

○

قضا کے بعد بھی جینا پڑے مجھے شاہدؔ
اے چشمِ ناز! مرادیں بکھیرتی رہنا

○

کہیں غروبِ تمنّا، کہیں طلوعِ خیال
مری حیات اسی زیر و بم میں مضمر ہے

قہر و غضب کے ورد میں تھی گونج اس قدر
اپنا محبتوں میں سفر رائیگاں لگا

○

ذکرِ رنجش علاجِ رنج نہیں
اس روش سے جُدا بھی ہو دیکھیں

○

ایسی بھائی ہے بانسری کی صدا
جی نہ بہلا نگار خانوں میں

○

نہیں ہے تُو جو مرا منتظر تو یاد نہ آ
تجھے ہے اس میں تأمّل اگر تو یاد نہ آ

میں اپنے ظرفِ جنوں سے چھلک نہ جاؤں کہیں
تو میری جان! مجھے اس قدر تو یاد نہ آ

میں آشنا ہوں شبِ ہجر کی طوالت سے
تو شامِ غم میں برنگِ سحر تو یاد نہ آ

اَنا پرست ہوں مجبوریاں سمجھتا ہُوں
بدل چکی ہے تری رہگزر تو یاد نہ آ

سفر طویل ہے ٹھہر نہ انتظار میں رکھ
نصیبِ تن ہے اکیلے سفر تو یاد نہ آ

○

نقشِ کہنہ مٹا کے دیکھیں گے
اب نیا گھر بنا کے دیکھیں گے

آرزوؤں کے رنگ کیسے ہیں
ان کو باہم ملا کے دیکھیں گے

علّتوں پر گرا کے اب پردے
خوبیاں گنگنا کے دیکھیں گے

جس کا منصب ہے روشنی دینا
اس کو ظلمت میں لا کے دیکھیں گے

غم کی دنیا بسیط ہے کتنی
چار سو ہم بھی جا کے دیکھیں گے

اپنی دنیا تراش کر آخر
اس میں خود کو بسا کے دیکھیں گے

اب تو اظہرؔ نشاطِ بزمِ طلب
اپنے رُخ پر جما کے دیکھیں گے

○

اب مضطرب ہے شوق کہ وہ راستہ ملے
ہر نقشِ پا جہاں مجھے منزل نما ملے

ذوقِ سفر کے ساتھ بڑھوں جس کی سمت میں
وہ میری منزلوں کو سجاتا ہوا ملے

چلتا رہوں میں جس کے سہارے یہ رات دن
ایسا کوئی تو ہو جو مجھے جا بجا ملے

کانٹوں کا پیرہن ہو مرے جسم پر مگر
جب کھل اُٹھوں تو دہر کو مہکی فضا ملے

جی چاہتا ہے شعلۂ اُلفت میں یُوں جلوں
ڈھونڈے کوئی جو مُجھ کو اسے کیمیا ملے

اظہر وہ نُورِ سرمئی رستے پہ تو بکھیر
منزل سے ناشناس بھی منزل کو جا ملے

فردیات

میں جس خواہش کو لے کر راہِ منزل ڈھونڈنے نکلا
مٹا دی وہ تو رستے بے کراں دوڑے مری جانب

○

جانے کیسے مل سکے گا ربطِ باہم کا سراغ
میں محبت میں ہوں گم، تو مصلحت میں غرق ہے

○

جا بجا ڈھونڈا کیے گو تیرا پیکر مونس
پھر بھی تو راز رہا عہدِ گذشتہ کی طرح

اب تو اپنی سطح تک آنا بھی ناممکن لگے
دے گئی ہے تیری رفعت مجھ کو وہ گہرائیاں

○

قامتِ حُسن جب بھی یاد آئی
اپنی پستی پہ جا رُکیں نظریں

○

ترکِ اُلفت کا ارادہ کر کے آج
اپنی نظروں سے گِرا جاتا ہوں میں

○

اس سے بڑھ کر اور کیا دکھ دُوں میں اپنی ذات کو
اب تو تیری یاد بھی خود سے خفا رکھتا ہوں میں

تریاق

میں کھل اٹھا ہوں چمن میں مگر یہ علم نہ تھا
ہر ایک ہاتھ کے پیچھے ہے ذہن گلچیں کا
صبا کے سینے میں رقصاں مزاجِ صرصر ہے
سراب اوڑھے ہوئے ہے یہاں کا ہر منظر
نہاں ہیں برق و شرر بھی گھٹا کے پردے میں
دلوں میں بُغض لبوں پر وفا کے چرچے ہیں
ہر آئینے پہ ملمّع ہے خود فریبی کا
مگر یہ دل کہ کسی پل نہیں قرارِ جسے

اُسے وہ ایک حقیقت تلاش کرنی ہے
دیا ہے اہلِ جنوں نے جسے خلوص کا نام
رواں ہے سعیٔ مسلسل میں اس یقین کے ساتھ
منافقت کی یہ دیوار ٹوٹ جائے گی
نکل کے میرے نشیمن سے پیار کی خوشبو
فضائے دہر میں ہر سمت پھیل جائے گی
ریا کے زہر کا تریاق بن کے چھائے گی